سید بدر الدین مرحوم

پٹنہ کی یادیں، بچپن کی باتیں

غالباً ۱۸۸۰ء اور ۱۸۸۵ء کے لگ بھگ ایک بزرگ تجارت کے سلسلہ میں صوبہ پنجاب کے ضلع گجرات سے پٹنہ آئے۔ یہ ضلع گجرات کے ایک باعظمت خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جو سیادت و وجاہت اور سلسلہ بیعت کے لئے مشہور تھا۔ یہ خود بھی بہت ہی متدین اور متشرع اخلاق و عادات میں بہت ہی منکسر المزاج اور ملنسار تھے۔ محلہ جھاؤ گنج میں جو خواجہ عنبر کی مسجد ہے اسی کے حواشی مکانوں سے ایک میں ٹھہرے۔ ان کی تجارت کا شمیری شال اور جامہ وار (اعلیٰ قیمتی کپڑا) کے علاوہ مشک و زعفران کی تھی۔ جلد ہی انکی وجاہت، پیشہ میں ایمانداری اور اعلیٰ درجے کی چیزوں کی بکری کے باعث انکی رسائی پٹنہ کے بڑے بڑے گھروں میں ہونے لگی۔ کچھ دنوں کے بعد انہوں نے خواجہ عنبر کی مسجد کے قریب ایک مکان کرائے پر لیا۔ اور اس میں جا رہے اور دو چار برس بعد اپنے بچوں اور ایک بھتیجے کو بھی پنجاب سے لے آئے جوان کی نگرانی میں مکتب اور اسکول میں پڑھتے تھے۔ ان کے بھتیجے سید ضیاء الدین جو حافظ قرآن تھے اور وہ تجارت میں ان کا ہاتھ بھی بٹاتے تھے۔ اپنے چچا ہی کی طرح بڑے متدین اور متشرع بھی تھے۔ دونوں چچا بھتیجا ساتھ ہی رہتے تھے، کبھی مال کی بکری میں ساتھ جاتے اور کبھی الگ الگ، پنجاب سے جو اشخاص آتے وہ ان دونوں سے ملنے کو ضرور ان کے پاس جاتے آس پاس کے سکھ حضرات بھی ان کی بہت تعظیم و تکریم کرتے۔

انہی دنوں محلہ خانہ باغ پٹنہ میں ایک بزرگ رئیس سید احمد شاہ رہتے تھے۔ ان کا مکان بھی خانہ باغ کہلاتا تھا اور اسی مکان کے نام پر یہ محلہ بھی خانہ باغ کہلانے لگا۔ سید احمد شاہ صاحب نجیب الطرفین سید تھے۔ انکو تلاش تھی کہ کوئی اعلیٰ خاندان کا لڑکا مل جائے تو اپنی بیٹی کی اس سے شادی کر دیں۔ جب سید ضیاء الدین صاحب اپنے چچا کے ساتھ تجارت کے سلسلہ میں پٹنہ آئے تو ان کو بہت پسند آئے۔ انکے یہاں دونوں چچا بھتیجا کا آنا جانا بڑھا تو سید احمد شاہ نے حافظ سید ضیاء الدین صاحب کو بہت زیادہ نزدیک سے دیکھا۔ لوگوں سے انکے خاندانی حالات معلوم ہو ہی چکے تھے۔ اب نسبت کا سلسلہ چلا تو بات پکی ہوتے دیر نہیں لگی۔ غرض سید ضیاء الدین سید احمد شاہ کے داماد بن گئے۔ سید ضیاء الدین صاحب کے ہاں کوایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام تو سید شرف الدین احمد رکھا گیا مگر حافظ سید ضیاء الدین اس کو عطاء اللہ کے نام سے پکارتے تھے۔ یہی نام آخر میں انکا نام پڑ گیا۔ سید ضیاء الدین صاحب کے چچا آخر عمر میں ضلع گجرات چلے گئے۔ اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے بیٹوں میں ایک صاحب پٹنہ میں ہی رہ گئے اور پولیس میں سب انسپکٹری کی ملازمت کرلی انکا نام سید محمد اسمٰعیل تھا۔ (۱) کچھ دنوں کے بعد حافظ سید ضیاء صاحب کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت عطاء اللہ شاہ محسن تھے مگر انکے والد صاحب نے خود انکی دیکھ بھال شروع کی۔ اپنی اہلیہ کی زندگی میں بھی محلہ خانہ باغ کے قریب محلہ

لنگر گلی میں ایک مکان خرید لیا تھا وہیں رہتے اور شال دو شالہ جامہ ار اور مشک و زعفران کی تجارت کرتے تھے۔ سال دو سال میں پنجاب بھی چلے جاتے۔ کچھ دنوں کے بعد سید ضیاء الدین صاحب نے دوسری شادی پنجاب میں کی مگر پٹنہ کو پھر بھی نہیں چھوڑا۔ اب سید عطاء اللہ شاہ عنفوان شباب کی سرحد میں پہنچ چکے تھے۔ اسی زمانے میں میرے والد مرحوم سید ضمیر الدین احمد صاحب نواب سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال کے یہاں ان کے اجلاس کامل کے نائب صدر اور ان کے چیف سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہو کر جانے لگے تو یہ فکر ہوئی کہ میری دیکھ بھال کے لئے کوئی اچھا آدمی مل جائے۔ اس کے لئے سب سے زیادہ موزوں سید ضیاء الدین صاحب تھے یہ والد مرحوم کے دوست بھی تھے، دیانتدار اور بڑے ہمدرد بھی۔ رہ رہ کر میرے والد مرحوم کی نظر انتخاب حافظ سید ضیاء الدین صاحب ہی پر ٹھہرتی تھی مگر ہچکچاتے تھے کہ ان سے میری تعلیم اور نگہداشت صدر گلی میں رہ کر کرنے کی بات کہیں یا نہیں۔ آخر ایک دن جب حافظ صاحب مرحوم تشریف لائے تو والد مرحوم نے اپنی مشکل ان کے آگے پیش کی، جس میں یہ استدعاء بھی تھی کہ بھوپال جب والد مرحوم جائیں تو پٹنہ میں میری تعلیم و تربیت اور نگہداشت کا کام حافظ صاحب انجام دیں۔ حافظ سید ضیاء الدین صاحب نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ یہ بات منظور کر لی مگر شرط یہ رکھی کہ باورچی خانہ الگ اپنا رہے گا۔ جناب حافظ سید ضیاء الدین صاحب اس پر سختی سے مصر تھے۔ آخر انہیں کی بات رہی۔ جناب حافظ صاحب کو والد مرحوم صرف میری تربیت تعلیم و نگہداشت کا کام نہیں سپرد کر گئے بلکہ گھر کا مختار کل بھی انکو بنا کر گئے۔ اب حافظ سید ضیاء الدین صاحب اپنے مکان لنگر گلی سے میرے مکان محلہ صدر گلی میں اٹھ آئے۔ ان کے فرزند سید عطاء اللہ بھی ان کے ساتھ آ گئے۔ جن کو میں عطاء اللہ بھائی کہتا تھا۔ سید عطاء اللہ کی عمر اس وقت اٹھارہ انیس سال کی ہو گی۔ یہ مجھ سے تقریباً دس سال بڑے ہوں گے۔ انہوں نے بھی قرآن شریف حفظ کر لیا تھا۔ مگر پھر بھی کچے تھے۔ قرآن شریف کی تلاوت اور گردان میں بڑی تساہلی کرتے اور اس کے لئے جناب حافظ صاحب کی ڈانٹ بھی سنتے۔ سید عطاء اللہ نے ابتدائی عربی کتابیں بھی پڑھ لی تھیں۔ صدر گلی آئے تو ہمارا گھر بھرا ہوا ملا۔ ہم سبھوں کا مکان بہت بڑا تھا۔ ایک محلہ ہی کہیئے۔ میرا مکان، میرے ماموں صاحبان کے مکانات زنانے اور مردانے حصے سب ایک ہی حلقے میں تھے۔ سید عطاء اللہ ایک تو یہ یونہی کھلنڈرے اور ہنسوڑ طبیعت کے نوجوان تھے۔ یہاں ان کو ساتھی بھی مل گئے۔ کچھ یہاں کے اقامت پذیر طلباء اور دو تین نوجوان میرے ماموں صاحبان یہ سب انکے ساتھی اور دوست تھے۔ عطاء اللہ شاہ بچپن سے ہنسی مذاق اور لطیفہ بازی کے آدمی تھے۔ یہاں ان کا خوب جی لگا۔ صبح اور شام حافظ صاحب مجھے قرآن شریف اور دوسری کتابیں پڑھاتے۔ ان وقتوں میں پڑھنے کے لئے سید عطاء اللہ بھی پکڑے جاتے اکثر ان کے ساتھ یہ ہوتا کہ تھوڑا سا پڑھ کر جناب حافظ صاحب سے کہتے کہ اب نہیں پڑھوں گا اور حافظ صاحب فرماتے کہ اچھا کتابیں اٹھا لو اور جاؤ۔ میں نے دیکھا کہ یہ پڑھنے سے چھٹکارا پانے کی اچھی ترکیب ہے چنانچہ ایک دفعہ یہی داؤ میں نے بھی استعمال کیا۔ پڑھتے پڑھتے میں نے بھی حافظ صاحب سے کہا کہ اب نہ پڑھوں گا۔ میں نے یہ سمجھا تھا کہ گلو خلاصی ہو جائے گی مگر میرے اس

کہنے پر ایک زلزلہ آیا۔ جناب حافظ صاحب گرج کر بولے تو نہیں پڑھے گا تو تیرا کچومر نکال دوں گا۔ عطاء اللہ کی پیروی کرنے چلا ہے۔ تو اس کی ریس نہ کر۔ حقیقت یہ تھی کہ سید عطاء اللہ اگرچہ ان کے بیٹے تھے مگر جناب حافظ صاحب مجھے بھی ان سے کم نہ سمجھتے تھے اور بڑی محبت کرتے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ سید عطاء اللہ بچپن ہی سے آزاد منش اور ایک حد تک سرکش بھی تھے۔ اور اسی لئے جناب حافظ ان پر زیادہ سختی بھی نہیں کرتے تھے۔ ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس لئے دل جوئی بھی کرتے تھے۔ جناب حافظ سید ضیاء الدین کی تجارت یہاں بھی جاری تھی۔ کبھی خود معزز خریدار آپ کے پاس آجاتے کبھی یہ لیلے لوگوں کے یہاں جاتے تو انکے حسب فرمائش شال دوشالے خریدنا چاہتے اگر پسند کی چیزیں نہ ہوتیں تو کشمیر سے خط لکھ کر منگواتے اور ان کو دیتے۔

جناب حافظ صاحب تقریباً ساڑھے چار سال میرے یہاں مستقل طور پر رہے اور عطاء اللہ شاہ صاحب بھی ان کے ساتھ یہاں رہے۔ آخر میں عطاء اللہ شاہ صاحب میرے گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگے۔ ایک دفعہ میرے ایک ماموں عبدالحفیظ صاحب جو دیہات میں رہتے تھے انکو اپنے ساتھ دیہات لے گئے وہاں یہ پانچ چھے مہینے رہ گئے ان کا خوب جی لگا دیہات کے لہلہاتے کھیت ان کو خوب پسند آئے۔ دیہات کی ندیوں میں مچھلی کا شکار ان کو خوب پسند آیا۔ بڑے بڑے جال، جسے زمین پر بچھا کر تیتر اور بٹیر کا شکار کرتے ہیں یہ خوب مشاق ہو گئے۔ انہیں دنوں جب میرے والد مرحوم بھوپال سے کچھ دنوں کی رخصت لیکر آئے تو وہ عطاء اللہ شاہ صاحب سے بڑی محبت کرتے تھے۔ وہ انکو اپنے ساتھ لے گئے۔ بھوپال میں یہ آٹھ نو مہینے رہے۔ وہاں کی روداد یہ بڑے مزے میں بیان کرتے تھے۔ جناب حافظ سید ضیاء الدین صاحب صدر گلی میں تھے تو ایک دو دفعہ چند ہفتوں کے لئے اپنے گھر گجرات پنجاب بھی ہو آئے یہاں انہوں نے عطاء اللہ شاہ کی والدہ کے انتقال کے بعد اپنی برادری میں دوسری شادی کر لی تھی۔ یہ محترمہ بڑی خدا ترس، عبادت گزار اور حافظہ بھی تھیں۔ ان سے جناب حافظ صاحب کو ایک لڑکا بھی تھا۔ حافظ سید عطاء الرحمن شاہ صاحب مرحوم جن کا گزشتہ برس انتقال ہو گیا: مرتب) جب والد صاحب مرحوم ۱۹۱۱ میں بھوپال کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر واپس آگئے تو جناب حافظ سید ضیاء الدین صاحب پھر واپس اپنے گھر واقع محلہ لنگر گلی چلے گئے مگر ہفتہ میں دو تین دفعہ صدر گلی ضرور آجاتے تھے۔ کچھ ہی دنوں بعد حافظ سید ضیاء الدین صاحب مستقلاً اپنے گھر گجرات پنجاب چلے گئے۔ اور ان کے ساتھ عطاء اللہ شاہ بھی گئے۔ پنجاب ہی میں (امرتسر شہر میں) عطاء اللہ شاہ نے اپنی عربی تعلیم مکمل کی اور مدرسہ سے نکلے تو اپنے ساتھ علم و فضل اور فصاحت و بلاغت اپنے جلو میں لیکر نکلے۔

تقریباً عطاء اللہ شاہ صاحب کو پٹنہ سے گئے ہوئے تو دس سال ہوئے ہوں گے کہ معلوم ہوا کہ حضرت مولانا سید عطاء اللہ بخاری پٹنہ آئے ہیں اور ان کی بصیرت افروز تقریر دو ایک جگہ ہوئی جس میں لوگوں کا بڑا مجمع تھا اور ایک تقریر اسی دن پٹنہ سٹی کی جامع مسجد مدرسہ پر رات میں ہوئی یہ ۱۹۲۱ء کا زمانہ تھا جبکہ عدم تعاون کا ہر

طرف پر چار تھا۔ اور اسکول و کالج کی تعلیم کا طلباء بائیکاٹ کر رہے تھے۔ اس خبر کو کہ مولانا سید شاہ عطاء اللہ بخاری پٹنہ آئے ہیں کچھ ہی دیر گزری تھی کہ والد صاحب مرحوم کا ملازم خاص مجھے ان کے کمرے میں بلانے کے لئے آیا۔ جب میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک مولانا نما لحیم شحیم بزرگ بیٹھے ہیں، چہرے پر درمیانی درجہ کی داڑھی ہے، کھادی کا کرتہ اور اسی کا پائجامہ ہے اور سر پر چپکی ہوئی کھادی کی گول ٹوپی۔ مجھے دیکھ کر والد مرحوم نے ان حضرت سے کہا کہ لو میاں بدر الدین آ گئے۔ اب مولانا میری طرف پلٹے تو بڑی حد تک چہرہ جانا پہچانا نظر آیا۔ وہ لپک کر اٹھے اور مجھے بغل میں داب کر تقریباً زمین سے ایک فٹ اٹھا لیا اور میرا بھائی میرا بھائی کہتے ہوئے میری ہڈیاں اور پسلیاں چور کرنے لگے۔ بعد میں جب ان کو خود احساس ہوا کہ مجھے زور سے بھینچے ہوئے ہیں تو ہنس کر مجھے چھوڑ دیا۔ میں نے بغور دیکھا تو عطاء اللہ تو غائب تھے یہاں مولانا سید عطاء اللہ بخاری بیٹھے ہیں۔ چہرے کا کھلنڈرا پن صاف ہو چکا تھا، پیشانی پر سنجیدگی کی شکنیں تھیں، داڑھی شرعی حد میں تھی مگر ہونٹوں میں مسکراہٹ اور آنکھ کی چمک یہ کہہ رہی تھی کہ ہم وہی عطاء اللہ ہیں جو پہلے تھے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مجھ سے میرے پڑھنے کے متعلق پوچھا۔ میں نے کہا کہ بی، اے میں پڑھتا ہوں پھر میرے بچپن کے قصے سنانے لگے۔ یہ والد مرحوم کا بہت احترام کرتے تھے۔ والد صاحب مرحوم سرکاری گروپ کے آدمی تھے کیونکہ خان بہادر بھی تھے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کانگریس کے بڑے سرگرم رکن اور پنجاب کی احرار جماعت کے روح رواں بھی تھے۔ مگر ذرہ برابر بھی میرے گھر میں انہوں نے سیاست کا تذکرہ نہ چھیڑا۔ یہ عدم تعاون اور اسکول و کالج کے طلباء سے تعلیم کی بائیکاٹ کا مطالبہ اپنی گفتگو اور تقریروں میں کرتے پھرتے مگر میرے یہاں سوائے نجی حالات پر گفتگو کے سیاست کا ذکر نہ آنے دیا۔ دن بھر میرے یہاں رہے ان کے رفقاء پٹنہ میں ایک دوسری جگہ مقیم تھے اور یہ انہیں کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس کے دوسرے برس والد مرحوم کا انتقال ہو گیا۔ انکا لاہور سے تعزیت کا خط آیا پانچ چھے برس کے بعد مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری پٹنہ پھر اپنے دورے پر آئے اس وقت ملک کی آزادی کی پکار اور بڑھ گئی تھی۔ اور سیاست اب عوام میں رچ بس رہی تھی۔ اس دفعہ پٹنہ میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا استقبال بڑی شدومد سے ہوا۔ جوق کے جوق لوگ ان سے ملاقات کرنے کو اور انکی تقریر سننے کو امڈے پڑتے تھے۔ تقریریں ایسی ہوتی تھیں کہ گھنٹوں سنتے رہے مگر سیری نہ ہو۔ روتوں کو ہنسا دیں، ہنستوں کو رلا دیں اور چاہیں تو پانی میں آگ لگا دیں۔ تقریر کرتے وقت عوام کے جذبات کی باگ ڈور انکے ہاتھ میں ہوتی۔ جس طرف اور جس طرح چاہیں موڑ دیں۔ انکی تقریریں صرف ہیجانی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ تاریخی اور سیاسی مواد کے ساتھ ساتھ مذہبی ہدایات کے سلسلے بھی ان کی تقریریں میں جاری رہتے تھے۔ میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی پر مغز اور پروقار تقریریں بھی سنی ہیں، حیدر آباد کے بہادر یار جنگ کو بھی بڑے بڑے مجمعوں کو خطاب کرتے دیکھا ہے مگر انکی وہ معجز بیانی جو دل و دماغ کو سرشار کرتی تھی۔ اسے خدا نے مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہی کے حصہ کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ پٹنہ سے ان کو بے پناہ محبت تھی

اور کیوں نہ ہوتی۔ پٹنہ ہی میں وہ پیدا ہوئے، ماں کا بے حد و بے پایاں پیار ان کو یہاں ملا، انکا بچپن اور ان کا عنفوان شباب یہاں کی فضاء میں پروان چڑھا، انکے ابھرتے ہوئے شعور نے یہاں کے ماحول میں انگڑائی لی اور ان کی صلاحیتوں کی پہلی تربیت یہیں کی آب و ہوا میں ہوئی۔ یہ جب بھی پٹنہ آتے تو یہاں کی ہر تقریر میں اپنے پیار سے پٹنہ کی روداد سناتے یہاں کے لوگوں کا ہر تذکرہ بڑی محبت اور احترام سے کرتے اور لوگوں سے کہتے کہ پٹنہ بھی ان کا ویسا ہی وطن ہے جیسا پنجاب ہے۔ وہ اجنبی نہیں ہیں ان کا خمیر بھی پٹنہ ہی کے خمیر سے بنا ہے۔ میرے ایک عزیز ماموں زاد بھائی سید حسین احمد مرحوم پنجاب گئے۔ یہ ۱۹۴۵ء کا زمانہ تھا۔ لاہور کے اسٹیشن پر آگے جانے کو گاڑی لگی ہوئی تھی۔ انکو کراچی جانا تھا۔ ابھی ٹرین کے کھلنے میں دیر تھی۔ یہ کمپارٹمنٹ میں جا کر بیٹھ رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک جماعت چالیس پچاس آدمیوں کی آتی دکھائی دی جس میں ایک شخص بہت نمایاں تھے، ادھیڑ عمر کے، اچھے ہاتھ پاؤں کے، یہ مولانا اپنی گفتگو سے سبھوں کو محظوظ کرتے ہوئے مجمع میں سبھوں کے لیڈر معلوم ہوتے تھے۔ حسین احمد کا کمپارٹمنٹ سامنے ہی پڑتا تھا مولانا صاحب نے سیدھے اسی کا رخ کیا اور آکر اسی کے ایک خالی برتھ پر بیٹھے۔ جو پلیٹ فارم سے لگا ہوا تھا۔ ساتھیوں میں کچھ تو انکے ساتھ ہی کمپارٹمنٹ میں آکر بیٹھے مگر زیادہ تعداد انکے ساتھیوں کی پلیٹ فارم ہی پر رہی۔ کچھ ہی دیر کے بعد ٹرین نے چلنے کی سیٹی دی۔ اور ٹرین چل پڑی۔ اب مولانا نے کمپارٹمنٹ کا جائزہ لیا تو ایک طرف حسین احمد مرحوم پر نظر پڑی۔ انکی وضع قطع پٹنہ والوں جیسی نمایاں تھی۔ مولانا اپنی نشست سے اٹھ کر ان کے برتھ پر آگئے۔ اور پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ پٹنہ وطن ہے وہیں سے آرہا ہوں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ غریب خانہ پٹنہ کے ایک محلہ صدر گلی میں ہے۔ یہ سن کر مولانا کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کیا تم "حسنو" ہو؟ انہوں نے کہا ہاں میں حسنو ہی ہوں مگر آپ نے کس طرح سمجھا مولانا نے حسین احمد مرحوم کو بھینچتے ہوئے کہا کہ جسے گود میں کھلایا، جس کے والد صاحب کے ساتھ مہینوں ان کے دیہات پرجا کر انکے ساتھ رہا، پھر پٹنہ میں ان کے ساتھ رہا اس کو کیوں نہ پہچانتا۔ حسین احمد مرحوم سمجھ گئے کہ یہی عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں۔ مولانا عطاء اللہ شاہ نے پٹنہ کے جانے پہچانے لوگوں کا نام لیکر خیریت پوچھی گھر کے ہر فرد نوکر چاکر دائی ماما سب کا حال فرداً فرداً دریافت کیا۔ پھر پوچھا میرا بھائی بدر الدین کس حال میں ہے۔ مراد مجھ سے تھی۔ حسین احمد نے کہا کہ آج کل وہ بھی لیڈر ہیں۔ اس پر مولانا عطاء اللہ شاہ خوب ہنسے اور کہنے لگے یہ تو ہونا ہی تھا ایک بھائی لیڈر تو دوسرا کیوں نہیں ہو مگر میں سمجھتا ہوں کہ میں تو جماعت احرار میں ہوں اس لئے بدر الدین ضرور مسلم لیگ میں ہوں گے۔ حسین احمد مرحوم نے کہا کہ جی ہاں آپ ٹھیک سمجھے..... پھر حسین احمد مرحوم پر زور دینے لگے کہ وہ دو ایک دن ان کے ساتھ رہیں مگر اپنا ضروری کام بتا کر حسین احمد مرحوم نے معذرت کر لی۔ اور کہاں کہ بعد میں وہ آپ سے ملیں گے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا جب حسین احمد مرحوم واپس آئے تو مجھے یہ قصہ سنایا۔

غالباً ۱۹۳۷ء میں رہتک جیل میں سے ایک خط میرے نام آیا مجھے تعجب ہوا کہ یا اللہ رہتک جیل سے

مجھے خط بھیجنے والا کون ہے۔ لفافہ چاک کیا تو اندر مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا خط تھا۔ مجھے آج تک اس خط کا مضمون یاد ہے۔ لکھا تھا "میرے پیارے بھائی بدرالدین آج کل جیل کی تنہائی میں تم مجھے یاد آتے ہو، زمانہ دراز سے تمہیں نہیں دیکھا غالباً اس کی کسر بار بار تمہارے یاد آنے سے نکل رہی ہے، قوم کی خدمت کرنے کی سزا مجھے توقید تنہائی سے ملتی ہے، آج کل بھی وہی سزا ہے۔ تنہائی کو دور کرنے کے لئے میں نے کھادی کے کپڑے کے تھان کو اپنے ہاتھوں سے پیک کر کے تمہارا نام اور پتہ لکھا اور جیل والوں سے کہا کہ تمہارے پاس بھیج دیں۔ اس کو میری یادگار سمجھ کر قبول کر لینا۔ برسوں گزر گئے مگر کھادی کا تھان مجھے نہ ملا۔ غالباً جیل والوں نے اپنے مصرف میں لے لیا ہوگا۔

۱۹۴۰ء میں میں لاہور گیا تو یہ خواہش لیکر گیا کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری سے ضرور ملاقات کروں گا۔ اس وقت مسلم لیگ کا پنجاب میں بڑا زور تھا۔ دوسری مسلم سیاسی پارٹیاں جن میں جماعت احرار بھی تھی ماند ہو کر رہ گئیں تھی۔ اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، سارے پنجاب میں امیر شریعت اور جماعت احرار کے سب سے اونچے لیڈر ہونے کے باوجود بھی پسِ پشت ڈال دیئے گئے تھے۔ بہر حال میں نے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا پتہ لگایا تو معلوم ہوا کہ وہ تو جیل میں تشریف رکھتے ہیں۔ ان کے بال بچوں کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ امرتسر میں رہتے ہیں۔ لاہور سے پٹنہ آنے کے راستہ امرتسر پڑتا تھا۔ مجھے گولڈن ٹمپل، جو سکھوں کی مشہور زمانہ عبادت گاہ ہے، اس کے دیکھنے کی بھی تمنا تھی۔ میں اور میرے دو ساتھی دن بھر کے لئے امرتسر اتر گئے، اسباب اسٹیشن ہی پر کلاک روم میں رکھا اور اسٹیشن پر ہوٹل میں کھا پی لیا، پھر گولڈن ٹمپل دیکھنے کو چلے گئے۔ ایک بڑے حلقہ میں گولڈن ٹمپل واقع ہے، بیچ میں بہت بڑا تالاب ہے، اس کے چاروں طرف خوبصورت عمارتیں بنی ہوئی ہیں تالاب کے بیچ میں بھی سنگ مرمر کی عمارتیں ہیں۔ ایسی دلکش اور پر کشش کہ دیکھا کیجئے۔ کئی عمارتوں میں مقدس صورت مہنت بیٹھے گرنتھ صاحب پڑھ رہے تھے۔ گولڈن ٹمپل پہنچتے ہی ایک سن رسیدہ مہنت میرے ساتھ ہو گئے تھے اور ہر جگہ ہماری رہبری کر رہے تھے آخر میں سبھوں کو ایک بڑی خوبصورت سبک پل کے ذریعہ سے اس عمارت میں پہنچنا ہوتا تھا۔ میں وہاں پہنچا تو ہمارے راہبر نے کہاں کہ یہاں کے جو سب سے بڑے مہنت ہیں انہی کے پاس آپ کو لئے چلتا ہوں۔ اندر ایک سنگ مرمر کے تخت پر ایک بڑے باوقار سفید ریش بزرگ کو دیکھا جو گرنتھ صاحب پڑھنے میں مشغول تھے۔ انہوں نے ہم تینوں کو دیکھا تو کتاب بند کر دی۔ ہم نے مودبانہ ان کو سلام کیا انہوں نے بڑی محبت کے ساتھ سلام کا جواب دیا۔ پھر پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے کہاں کہ پٹنہ سے۔ یہ سننا تھا کہ جھٹ اٹھے اور مجھے گلے لگا لیا میرے ساتھیوں کو باری باری سے اور بڑی محبت سے کہنے لگے کہ آپ پٹنہ شریف سے آئے ہیں اس لئے ہم سبھوں کو سر آنکھوں پر آپ کا آنا ہے، آپ تو میرے معزز اور بڑے محبوب مہمان ہیں۔ پھر پوچھا کہ آپ کے اسباب کہاں ہیں اور ہمارے راہبر سے کہا کہ بھائی ان کے اسباب لیجا کر مہمان خانہ میں ٹھیک ٹھاک کر کے رکھو۔ میں نے عرض کیا کہ ہم سب تو سر راہ ہیں، صرف گولڈن ٹمپل کی زیارت کی تمنا کھینچ کر

لے آئی ہے۔ اور آج ہی شام کے وقت پٹنہ روانہ ہو جائیں گے مگر بڑے مہنت صاحب ہم سبھوں کو چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ آخر ہم سبھوں نے وعدہ کیا کہ دوبارہ آئیں گے تو انکی خدمت میں دوچار دن ضرور رہیں گے۔ پھر ہم سب وہاں سے رخصت ہوئے۔ آج تک گولڈن ٹیمپل کے لوگوں کی محبت کا برتاؤ اور پٹنہ سے ان کی عقیدت اور پٹنہ والوں کے ساتھ انکا برادرانہ خلوص میرے دل پر نقش ہے۔

گولڈن ٹمپل سے چلے تو دو بج رہے تھے مولانا عطاء اللہ شاہ کا مکان کس محلہ میں واقع تھا یہ مجھے معلوم نہ ہو سکا تھا۔ لوگوں سے پوچھتے پوچھتے آخر منزلِ مقصود تک پہنچ ہی گیا۔ ایک کشادہ گلی سے کچھ آگے بڑھ کر ایک کشادہ جگہ پر ایک نئی عمارت کھڑی تھی۔ سامنے ہی مردانہ نشست کا کمرہ معلوم ہوتا تھا۔ جو بند تھا۔ اس کے بغل سے لگا ہوا۔ ایک دروازہ تھا جو زنانہ حصہ میں جانے کا راستہ تھا۔ وہیں پر جا کر میں نے پکارا کہ کوئی صاحب ہیں؟ باہر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ پہلی ہی آواز پر ایک صاحب باہر آئے، تیس، پینتیس سال کی عمر ہو گی، متوسط قد کے خوش رو آدمی تھے، چہرے پر خشخشی داڑھی تھی۔

صاحب سلامت کے بعد پوچھا کہ آپ لوگ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں میں نے کہا کہ پہلے یہ تو بتائیے کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا یہی مکان ہے کہ نہیں؟ جواب ملا کہ مکان تو یہی ہے اور ان کی اہلیہ اور بچے اسی مکان میں ہیں مگر مولانا جیل میں ہیں۔ میں نے کہا کہ مولانا کا جیل جانا معلوم ہے۔ آپ انکی اہلیہ سے یہ کہہ دیں کہ بدرالدین پٹنہ سے آیا ہے۔ وہ صاحب یہ سن کر اندر گئے پانچ منٹ بعد باہر کی نشست گاہ کھلی، اچھا خاصہ کمرہ تھا۔ ہم سب کمرے میں پہنچے تو تین بچیاں میرے سامنے کھڑی تھیں، بڑی کی عمر نو سال ہو گی، دوسری تقریباً سات سال اور چھوٹی پانچ چھے سال کی۔ (شاہ جی کی صرف ایک بیٹی ہیں دوسری گھر میں پڑھنے والی بچیاں تھیں) ----- (مدیر)

سب آکر مجھ سے لپٹ گئیں۔ مجھے حیرت تھی کہ آخر ان سبھوں نے مجھے کس طرح پہچانا۔ میں نے سبھی کو پیار کے بعد ان کے نام پوچھے۔ اتنے میں بڑی لڑکی لپک کر اندر گئی اور پھر دو تین منٹ میں باہر آئی اور کہنے لگی کہ امی جان آپ کو سلام کہتی ہیں اور پوچھتی ہیں کہ آپ کے اسباب کہاں ہیں آپ کو چار پانچ دن یہاں رہنا ہے۔ میں نے کہا کہ تم اپنی امی جان کو میرا اسلام کہو، میں تو صرف تم سبھوں کو دیکھنے کے لئے آگیا تھا۔ بھائی جان جیل میں ہیں، اس لئے رہ کر کیا کروں گا۔ بڑی لڑکی نے جواب دیا کہ امی جان اور ہم سب تو ہیں۔ ابا جان ہمیشہ آپ کا ذکر ہم سبھوں سے کرتے رہتے ہیں کہ میرا ایک بھائی بدرالدین پٹنہ میں ہے۔ اللہ اللہ، مولانا عطاء اللہ شاہ کی محبت کہ طویل زمانہ گزرنے پر بھی انکی محبت میرے ساتھ کم نہ ہوئی۔ بچیوں کا اصرار کہ میں دو چار روز قیام کروں میرا یہ عالم کہ بچیوں سے گفتگو کے درمیان سارے گزشتہ واقعات کی تصویر نظر کے سامنے کھڑی ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بچیوں کو سمجھا رہا ہوں مگر وہ بہ ضد ہیں کہ میں قیام کروں۔ اتنے میں مولانا کی اہلیہ نے بڑا پر تکلف ناشتہ ہم سبھوں کے لئے بھیجا۔ وہ صاحب جو پہلے آکر ہم سبھوں سے ملے تھے ان کے متعلق ان سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ مولانا کے سالے ہیں۔ وہ میزبانی میں پیچھے جا